رموزِ بیخودی کے مضامین کا ایک جائزہ

ڈاکٹر عبدالشکور احسن

اسرارِ خودی کی طباعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اس کے تین سال بعد ۱۹۱۸ء میں رموزِ بیخودی چھپی۔ ۲۷ دسمبر کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کتابیں چھپنے سے پہلے سنسر ہوتی تھیں۔ فرماتے ہیں:

مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آ گئی ہے۔[۱]

یہ مثنوی نومبر ۱۹۱۷ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ کیوں کہ ۱۷ نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں مرقوم فرماتے ہیں:

مثنوی ختم ہو گئی ہے۔۔۔ چند روز کے بعد پریس میں دے دی جائے گی۔[۲]

خودی کے نئے تصور نے پڑھنے والوں کے اندر ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ فارسی زبان و ادب میں اس کا نیا مفہوم مستعمل نہ تھا۔ جب علامہ نے فرد کی بے پناہ اہمیت اور اس کے جوہرِ ذات کی لامحدود استعداد پر اظہارِ فکر کیا تو اس سے انسانی انا یا خودی کی حقیقت تو ایک نئے خیال انگیز اور انقلابی رنگ میں سامنے آئی، لیکن اس میں فرد اور ملت کے باہمی ربط اور حقوق و وظائف پر روشنی نہ پڑتی تھی اور انسان کی انفرادی عظمت اور خودی کی قوتِ تخلیق و تسخیر پر جو زور دیا گیا تھا، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ انفرادی خودی پر یہ اصرار اجتماعی زندگی کے تار و پود بکھیر دے گا۔ رموزِ بیخودی میں یہ غلط فہمی قطعی طور پر دور کر دی گئی ہے۔ اس میں علامہ نے فرد اور ملت کے باہمی ربط کی جس منطقی انداز میں صراحت کی اس سے فلسفۂ خودی و بے خودی کے درمیان مکمل ہم آہنگی کی حقیقت آشکار ہو گئی۔

جس طرح علامہ نے خودی کے لفظ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے، بعینہٖ بے خودی کو بھی بالکل نئے معنی پہنائے ہیں۔ اگر خودی سے علامہ کی مراد اثبات و تعین ذات ہے تو بے خودی سے مراد فرد کا جماعت میں انضمام ہے۔ فرد جماعت کی محبت میں اپنے اختیار سے خود دست بردار ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ:

در جماعت خود شکن گردد خودی

کتاب کا آغاز رومی کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

جہد کن در بے خودی خود را بیاب
زود تر واللہ اعلم بالصواب

یہاں علامہ نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو اپنے فلسفہ کے ساتھ تطبیق دیا ہے۔ اس کے بعد ''پیش کش بحضور ملت اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جہاں ان کے ہمنواؤں نے بت ترسا کے گیسو و رخسار کے گرد تخیل کے ہالے بنے ہیں اور ساقی مہ رو کے در پر جبیں فرسائی کی ہے، وہ ملت کی تیغ ابرو کے شہید ہیں اور اس کے در پر سوز و گداز کا ہدیہ لائے ہیں۔ نیلگوں آسمان ان پر افکار کے بادل برساتا ہے۔ وہ جوئے بار نغمہ خواں کی شکل میں ان سے ملت کے گلشن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وہ پھول کی طرح ملت کے سامنے عشق سے سرشار سینے کو چاک کر رہے ہیں۔ اور اس نیت سے اس آئینے کو اس کے سامنے عیاں کر رہے ہیں کہ وہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ سکے۔ شاید کہ اسے اس میں اپنا اصلی رنگ روپ نظر آجائے۔

تمہید کے تحت علامہ نے فرد و ملت کے باہمی ربط کو موضوع بحیثیت بنایا ہے اور دونوں پر ایک دوسرے کی اہمیت واضح کی ہے۔

فرد کے لیے ربط جماعت رحمت ہے اور اس کے جوہر خودی کی تکمیل ملت ہی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ فرد و جماعت ایک دوسرے کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر فرد کا وقار اور ذوق نمو ملت کا رہین منت ہے تو ملت بھی اپنے نظم باہمی کے لیے افراد کی محتاج ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہونا قطرے کا سمندر ہو جانا ہے۔ اس کا کہا ملت کا قول ہو جاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں خود ملت بن جاتا ہے۔ اگر فرد تنہا ہے تو وہ اپنے مقاصد کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتا اور اس کی انفرادی قوت کے آشفتہ ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ لیکن جماعت کے تقاضے اسے ربط و ضبط باہمی سے آشنا کرتے ہیں، اس کے اندر نرمی اور ہمدلی کی خو پیدا کرتے ہیں اور اسے رسم آئین کا پابند کر کے حقیقی آزادی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

اگلے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ ملت افراد کے اختلاط و آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اور ان کی تربیت کی تکمیل نبوت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔

اگرچہ فرد کی فطرت مائل بہ یکتائی ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی ہی سے ممکن ہے۔ افراد تسبیح کے دانوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اور رزمگاہ حیات میں ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم ہیں۔ ان کی مثال ستاروں کی ہے کہ ان کی انجمن کا راز جذب باہمی میں پوشیدہ ہے۔ ملت کے فکر و عمل میں پختگی و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے خدا اس میں کوئی صاحب دل پیدا کرتا ہے جس کی بات کے ہر

حرف میں جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ جس کے نغمے خاک راہ کو نئی زندگی بخشتے ہیں اور جس کی ذات سے زرۂ بے مایہ میں تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ فرد کو خداوندان باطل کی غلامی سے آزادی بخشتا ہے اور ایک مقصد کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ اسے نکتۂ توحید کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے اور اس کے اندر نیازمندی کی راہ و رسم کی طرح ڈالتا ہے۔

اگلا عنوان ''ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ'' ہے یہاں علامہ نے توحید اور رسالت پر مشتمل وہ عوامل گنوائے ہیں جو مسلمان قوموں کے درمیان ایک بنیادی وحدت کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ علامہ کی نظر میں دین، حکمت اور آئین کا سرچشمہ توحید ہے۔ قوت و سطوت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید بیم و شک کی کیفیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ زندگی عمل کی راہوں پر گامزن ہوتی ہے اور ضمیر کائنات آنکھوں کے سامنے عیاں نظر آتا ہے۔ جب انسان میں احساس بندگی پختہ تر ہو جائے تو کاسۂ گدائی میں جام جم کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ملت اسلامی جسم ہے تو لا الہ اس کے لیے جان کا حکم رکھتا ہے۔ یہی عقیدہ ملت اسلامی کے اسرار کا سرمایہ اور اس کے افکار کا شیرازہ ہے۔ یہ عقیدہ اسود و احمر کی تمیز اٹھا دیتا ہے اور ایک ایسی ملت کی تعمیر کرتا ہے جس کے قلب و ذہن اور فکر و جذبہ میں کامل یک رنگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ سازِ فکر ہے جس میں سوزِ حق سے ارتعاش کی لہریں اٹھتی ہیں۔ اس کے بعد علامہ نے وطنیت اور نسب پرستی کی مذمت کی ہے، اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دوسری قوموں کے ہاں ملت کی اساس احساس وطنیت یا نسل پرستی کے جذبے پر ہے لیکن ملت اسلامی کی بنیاد خدا پرستی پر ہے جسے دل اور جذبے کے رشتوں نے استوار کیا ہے۔ اس رشتہ محبت نے ملت اسلامی کے مدعا و مقصد اور طرزِ فکر و نظر میں ایک اساسی وحدت و ہمدلی پیدا کر دی ہے۔ پھر علامہ اس ملت کو 'یک نما'، 'یک بین' 'یک اندیش' کے نام سے یاد کرتے ہیں جسے عقیدۂ توحید نے یک زبان، یک دل اور یکجان بنا دیا ہے۔

علامہ عقیدۂ توحید کو انسانی نفسیات کی اصلاح و صحت مندی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں غم اور خوف اُم الخبائث ہیں، ان سے زندگی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ جب دل آرزو سے محروم ہو جائے تو زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس آرزوؤں کا پیہم سلسلہ امید کو جنم دیتا ہے جس سے زندگی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یاس زندگی کی جولانیوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ غم رگ جاں کے لیے نشتر بنتا ہے۔ مگر عقیدۂ توحید 'لا تقنطوا، اور 'لا تحزن' کا سبق دیتا ہے۔ رضا مسلمان کو ستارے کی درخشانی عطا کرتی ہے اور راہِ زندگی میں اس کے لبوں پر تبسم کے پھول کھلاتی ہے۔ اسی طرح قوت ایمان مومن کو خوف سے نجات دیتی ہے اور اس کی زندگی میں نکھار پیدا کرتی ہے۔ جب کلیم سوئے فرعون جاتا ہے تو اس کا قلب و جگر 'لا تخف' کے احساس سے سرشار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خوف عزم و ہمت پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ افکار و

کردار کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے۔ ہر شر کی جڑ خوف کے احساس میں پیوست ہے۔ اس سے تعلق و چاپلوسی، تزویر و ریا، مکر و فریب اور دروغ و کینہ فروغ پاتے ہیں۔ ان تمام امراض خبیثہ کا علاج توحید کا عقیدہ ہے۔ خوف ہی میں شرک کی جڑیں بھی پیوست ہیں اور جو دین اسلام کی روح سے واقف ہے وہ اس حقیقت سے خوب آشنا ہے:

ہر کہ رمزِ مصطفیؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس کے بعد علامہ نے اسرارِ خودی کی طرح اپنے افکار کو تیر و شمشیر کے مکالمے میں اورنگ زیب عالمگیر کے ایک تاریخی واقعہ سے مزید واضح کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ شہنشاہ اورنگ زیب (۱۰۶۸/۱۶۵۸-۱۱۱۸/۱۷۰۷) نے نماز کے دوران ایک شیر کو خنجر سے ہلاک کر دیا تھا، اور اس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ استغراق کے ساتھ نماز میں محو رہا تھا۔ رسالت کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں کہ قوم حرفِ بےصوت کی مانند ہے جسے رسالت ایک موزوں مصرع کی شکل عطا کرتی ہے۔

فرد کی بقا ذات خداوندی سے اور ملت کی زندگی رسالت سے وابستہ ہے۔ رسالت نے ہمیں دین و آئین دیا۔ قوت قلب و جگر بخشی اور کتاب عطا کی۔ ہمیں شیر و شکر کیا اور ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا بنایا۔ ہم مقصد افراد کی کثرت وحدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اور جب وحدت فکر و آرزو پختہ ہوتی ہے تو وہ ملت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وحدت اسلامی کا سرچشمہ دین فطرت ہے اور یہ دین ہم نے نبی اکرمؐ سے حاصل کیا ہے قوم کی قوت اور وحدت کا سرچشمہ وہ ذات اقدس ہے۔ اور یہ قوم ابد تک زندہ و پائندہ ہے۔ مسلمان غیر اللہ سے رشتہ توڑ کر ''لا قوم بعدی'' کا نعرہ لگاتا ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چون وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم

رسالت کا مقصد دنیا میں حریت و مساوات و اخوت کا قیام تھا علامہ نے یہاں تاریخ اسلامی سے ایسے

واقعات نقل کیے ہیں جن سے اسلامی معاشرے میں ان عظیم اقدار کی بنیادی حیثیت اور ان کی عملی تفسیر کا ثبوت ملتا ہے۔

اخوت کے سلسلے میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا ہے جو ایران پر مسلمانوں کے حملے دوران میں پیش آیا۔ ایک مسلمان نے ایرانی شاہنشاہ یزدگرد سوم کا ایک سپہ سالار گرفتار کر لیا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ایرانی فوج کا ایک بہت بڑا سردار ہے۔ سپہ سالار نے اس سے جان بخشی کی التجا کی۔ سپاہی نے تلوار نیام میں ڈال لی اور اس کی جان بخش دی۔ بعد میں جب اسلامی لشکر کو معلوم ہوا کہ یہ شخص ایرانی افواج کا سپہ سالار جابان ہے تو امیر لشکر حضرت ابوعبیدہؓ سے اس کے قتل کی درخواست کی گئی، مگر اُنھوں یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم میں سے ہر شخص ملت کا امین ہے۔ اس کی صلح ملت کی صلح اور اس کا انتقام ملت کا انتقام ہے۔ جب ملت فرد کی زندگی کی بنیاد بنتی ہے تو فرد کا قول ملت کا قول ہو جاتا ہے۔ جابان ہمارا دشمن ضرور تھا، لیکن ایک مسلم نے اسے امان بخشی ہے، اس لیے اب اس کا خون تیغ مسلم پر حرام ہے:

گفت اے یاران مسلمانیم ما
تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
ہر یکے از ما امینِ ملت است
صلح و کینش صلح وکینِ ملت است
ملت ار گردد اساسِ جانِ فرد
عہدِ ملت میشود پیمانِ فرد
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است

مساوات کے تحت خاندان عثمانی کے سلطان مراد کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ سلطان نے ایک مشہور معمار کو ایک مسجد کی تعمیر کی دعوت دی۔ مگر مسجد بنی تو سلطان کو پسند نہ آئی، اور آپے سے باہر ہو کر اس نے معمار کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ معمار قاضی کے پاس پہنچا اور از روئے قرآن بادشاہ کے ظلم کے خلاف داد رسی چاہی۔ قاضی نے فوراً بادشاہ کو طلب کیا۔ سلطان قرآن مجید کی ہیبت سے لرز اٹھا، اور ایک عام ملزم کی طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ قاضی نے شہنشاہ سے کہا کہ قرآن 'قصاص' کا حکم دیتا ہے اور یہی زندگی کا اٹل قانون ہے۔ مسلمان سب برابر ہیں اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے رنگین تو نہیں ہے:

گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوۃ
زندگی گیرد بایں قانون ثبات

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست
خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

سلطان نے جب یہ آیت سنی تو سرخم تسلیم کرتے ہوئے چپکے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے اس رویے کو دیکھ کر مدعی نے بے اختیار ہو کر قرآن مجید وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے، اور ساتھ ہی یہ کہہ اٹھا کہ میں نے تجھے بہر خدا و مصطفیؐ معاف کیا۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں:

یافت مورے بر سلیمانے ظفر
سطوتِ آئینِ پیغمبرؐ نگر
پیشِ قرآن بندہ و مولا یکیست
بوریا و مسند و دیبا یکیست

حریت کی حقیقت واقعۂ کربلا کی روشنی میں واضح کی گئی ہے۔ یہ واقعہ عقل سفاک پر عشق کی کامرانی کی زندہ دلیل ہے۔ عشق کو آرام جاں آزادی میں ملتا ہے۔ اسی آزادی کی خاطر عشق نے میدانِ کربلا میں عقل ہوس پرور سے ٹکر لی، اور حریت کے مظہر جاوداں حضرت امام حسینؓ نے اپنے خون سے عشق غیور کو سرخ رو کیا۔ حق و صداقت شبیری ہی سے زندہ ہے اور اسی سے ظلم و استبداد کی جڑ کٹتی ہے:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید
چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم
چون سحابِ قبلہ باران در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

اس درخشاں تاریخی کارنامے کے بعد علامہ نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ چونکہ ملت محمدیہؐ کی بنیاد توحید و رسالت کے عقیدے پر ہے اس لیے یہ ملت حدود و مکان سے بے نیاز ہے:

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرزبومِ او بجز اسلام نیست

رموز کا اگلا موضوع یہ ہے کہ مسلمان مرزوبوم میں نہیں رہ سکتا، اور جغرافیائی اور وطنی حدود اس کے

شعور ملی کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ سرور کائنات ﷺ کا مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا واقعہ مسلمان کے لیے عقیدۂ قومیت کو سلجھانے کے لیے مشعل راہ ہے۔ حکمت نبویؐ نے ایک وسیع بین الاقوامی برادری، جسے علامہ نے ''ملت گیتی نورد'' کے نام سے یاد کیا ہے، کی بنیاد کلمہ پر اٹھائی ہے اور تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا ہے۔ ہجرت کا راز اسی اہم نکتے میں پنہاں ہے۔ یہ مسلمان کی زندگی کا آئین ہے۔ مسلمان قید جہات سے آزاد ہے۔ اور بوئے گل کی طرح، جو پھول کو چھوڑ کر سارے چمن کو مہکا دیتی ہے، وہ ایک مقام سے وابستہ نہیں بلکہ پورا عالم شش جہت اس کی جولا نگاہ ہے۔

اسلام کے بین الاقوامی تصور کو پیش کرنے کے بعد علامہ کا ارشاد ہے کہ ملت اسلامی کی بنیاد وطن نہیں ہے۔ وطن اخوت کے رشتے کو توڑ دیتا ہے اور نوع انسانی کو قبیلوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وطن کی بنیاد پر قومیں ابھرتی ہیں لیکن انسانیت ختم ہو جاتی ہے:

آدمیت گم شد و اقوام ماند

علامہ کی رائے میں جب یورپ میں سیاست نے مذہب کی جگہ لی تو وطنیت کا موجودہ تصور پیدا ہوا اور میکیاولی نے بادشاہوں کے لیے ایک کتاب لکھ کر رزم و پیکار کا میدان گرم کیا[۲۲]۔ جس طرح ملت اسلامیہ حدود و ثغورِ مکانی سے بے نیاز ہے، اسی طرح وہ قیدِ زمان سے بھی آزاد ہے۔ امت کا تسلسل برقرار ہے اور رہے گا۔ فرد اور قوم میں فرق ہے۔ فرد اپنی راہ لیتا ہے مگر ملت قائم و دائم ہے۔ فرد کی تخلیق مٹی سے ہوتی ہے، لیکن قوم کسی صاحب دل کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہے۔ فرد کی زندگی کا دار و مدار جان وتن کے رشتے پر ہے مگر قوم روایات کے بل بوتے پر زندہ و تابندہ ہے۔ ہاں اگر قوم مقصدِ حیات کو ترک کر دے تو یہ اس کے لیے موت کا پیغام ہے۔ یہاں علامہ ملت اسلامی کو ایک عام قوم سے ممیّز کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امت مسلمہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ قوم اجل کے خوف سے بے پرواہ ہے۔ یہ وہ چراغ ہے جسے پھونکوں سے نہیں بجھایا جاسکتا۔ اس پر بڑی آفتیں گزریں اور بڑی مصیبتیں ٹوٹیں۔ اسے فتنۂ تاتار نے پامال کیا لیکن اسی آتش تاتار نے اس کے لیے گلزار کا سامان پیدا کر دیا، اس لیے کہ اس قوم کی فطرت ابراہیمیؑ ہے اور یہ آتش نمرود کو گلستان بنا سکتی ہے۔ انقلاب روزگار کے شعلے جب اس قوم کے گلشن پر لپکتے ہیں تو بہار کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ آج نہ رومی باقی ہیں نہ یونانی، نہ جلال فراعنہ باقی رہا اور نہ شوکت ساسانی، مگر کوہ و دشت میں آج بھی اذان کی صدا گونجتی ہے۔ ملت اسلامی کا وجود باقی ہے اور رہے گا۔ عشق زندگی کا قانون ہے اور سالمات عالم میں اسی سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عشق ہمارے سوز دل کی بدولت آج بھی زندہ ہے اور لا الہ کے شرر سے آج بھی تابناک ہے۔

رموز کا اگلا موضوع یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک آئین ہوتا ہے یہ آئین نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جاتا

ہے۔آئین قانون زندگی ہے۔ پتا آئین کا پابند ہوکر پھول بن جاتا ہے۔آواز ضبط و نظم سے نغمے میں ڈھل جاتی ہے۔مسلمان کا آئین قرآن ہے جس کی حکمت ابدی ہے اور جونوع انسانی کے لیے آخری پیغام ہے۔ اس کتاب نے رہزنوں کو رہنما بنایا ہے۔اس کی ایک کرن نے دشت پیماؤں کے دماغ میں علوم کی شمعیں روشن کی ہیں۔اس نے غلاموں کو آقا بنایا ہے۔ جہانباتی کے نئے نغمے بکھیرے ہیں اور اس کے ادنیٰ غلام مسند جم پر متمکن ہوئے ہیں۔علامہ مسلمان کو جھنجھوڑتے ہیں کہ اس کا ایمان گرفتار رسوم ہے، اور اس انداز کافرانہ کا علاج ہے تو فقط قرآن میں:

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو
شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

رموز کا اگلا موضوع حیات ملی کے مرکز محسوس کی اہمیت پر ہے۔ یہ مرکز محسوس بیت الحرم ہے۔کوئی قوم ہو اس کی اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک مرکز پر سمٹ آئے۔مرکز ہی سے قوم میں ربط و نظام پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے زندگی کو دوام میسر آتا ہے۔ملت اسلامی کا راز اور اس کا سوز وساز بیت الحرام سے وابستہ ہے۔ یہ ملت اس کے طواف میں ہم نفسی کی دولت سے سرشار ہوتی ہے۔اسی آستان سے رشتہ و پیونداس کی زندگی اور دوام کا ضامن ہے۔ یہاں علامہ نے قوم موسیٰ کی مثال دی ہے کہ جب وہ مرکز سے کٹ گئی تو اس کا ملی شیرازہ پراگندہ ہوگیا۔ وہ زمانے میں رسوا ہوئی اور زندگی خون بن بن کے اس کی آنکھوں سے ٹپکی۔مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیرہن کو جامۂ احرام بنائے اور سجدوں میں گم ہو جائے کہ اس کے آبا کا یہی نیاز ''ناز عالم آشوب'' بن کر افق زمانہ پر طلوع ہوا تھا۔

اس کے بعد علامہ ملی زندگی کا نصب العین مضبوطی سے تھام لینے کو جمعیت حقیقی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ان کی نظر میں جس طرح فرد کی زندگی میں مدعا ومقصد کی تخلیق و تسلسل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح ملی زندگی بھی اس کے بغیر تشنۂ تکمیل ہے۔مقصد عمل میں اسی طرح پنہاں ہے جس طرح جسم میں جان۔مقصد ہی سے عمل کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ملت اسلامی کا مقصد حفظ و نشر 'لا الہٰ' ہے اور اسی کی تکمیل میں اسے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔اس کا فرض ہے کہ وہ نکتہ سنجان عالم کو صلائے عام دے اور نبی امیؐ کا پیغام ان تک پہنچائے۔

فکر انسان بت گر اور بت پرست ہے۔اب اس نے ایک تازہ تر پروردگار تراشا ہے جس کا نام رنگ، ملک یا نسب ہے۔اس بت ناارجمند کے سامنے آدمیت کو بھیڑ کی طرح ذبح کیا گیا ہے۔شاعر مسلمان کو

دعوت عمل دیتا ہے کہ بڑھ کر اس حق نما باطل پر لا الہ کی تیغ کا وار کرے۔ وہ تکمیل حیات کا مظہر ہے اس کا فرض ہے تاریکی حیات میں روشنی کا پیغامبر ثابت ہو۔ اس کے بعد علامہ نے تسخیر عالم کے مضمون کو لیا ہے جو ان کی نظر میں حیات ملی کی توسیع کا ذریعہ ہے۔ مشکلات سے نبرد آزمائی جس طرح فرد کی زندگی میں جلا پیدا کرتی ہے، اسی طرح قوم کی زندگی میں نکھار کا باعث بنتی ہے۔ شاعر کی نظر میں ما سوا صرف تسخیر کے لیے ہے۔ یہ ملی عزائم کی جولانگاہ ہے اور اس میں الجھنیں جتنی زیادہ ہوں گی اتنا ہی ان کے سلجھانے میں کیف ہو گا۔ اگر ملت اپنے آپ کو مثال غنچہ پاتی ہے تو اسے اپنی صلاحیتوں سے چمن آباد کرنا ہے۔ اگر وہ شبنم ہے تو اسے خورشید کو مسخر کرنا ہے۔ جو عالم محسوسات پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ذرے سے دنیائیں آباد کرتا ہے۔ عالم اسباب کو حقیر سمجھنا حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ اس کی غرض و غایت مسلمان کی خودی کی توسیع اور اس کی استعداد ممکنہ کا امتحان ہے۔ آدم کو نائب حق بنایا گیا ہے، اور عناصر حیات اس کی حکمرانی ایک مسلم حقیقت ہے۔ وہ ستارے جنھیں اقوام کہن نے دیوتا بنا رکھا تھا انسان کے غلام حلقہ بگوش ہیں:

ثابت و سیارۂ گردون وطن
آن خداوندانِ اقوامِ کہن
این ہمہ اے خواجہ آغوشِ تو اند
پیش خیز و حلقہ در گوشِ تو اند

علامہ ذوق جستجو کو علم و ہنر سے محکم کرنے اور انفس و آفاق پر چھا جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ حقائق اشیا کو سمجھنے کی کوشش پر زور دیتے ہیں، کہ جو حکمت اشیا سے بہرہ ور رہے وہی توانا ہے۔

انفرادی خودی کی مانند ملی خودی کا اپنا وجود ہے۔ اس احساس خودی کی تولید و تکمیل ملی روایات کے تحفظ سے ہوتی ہے۔ ملی روایات کی یاد قوم میں خود شناسی کا جوہر پیدا کرتی ہے۔ اس یاد سے غافل ہونا قوم کے لیے ہلاکت آفریں ہے۔ ملی بقا اور تکمیل خودی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے حال کو ماضی کے ساتھ مربوط رکھیں، اور ایسا قدیم روایات کے تحفظ ہی سے ممکن ہے۔ تاریخ کا مقصد بھی یہی ہے۔ تاریخ داستان یا افسانے کا نام نہیں یہ قوم میں اپنی ذات کا شعور پیدا کرتی ہے اور اس کی استعداد کو اجاگر کرتی ہے۔ تاریخ کی شمع ملتوں کے لیے ایک درخشاں رہنما ستارہ ہے جس سے آج کی رات ہی روشن نہیں گزرے ہوئے کل کی رات کی جبیں بھی تابندہ ہے۔ تاریخ کے تحفظ سے دوش و امروز ہی آپ میں پیوست نہیں بلکہ امروز سے فردا کا چراغ بھی جلتا ہے۔ اگر ملت حیات جاوداں چاہتی ہے تو وہ ماضی کا رشتہ حال اور مستقبل سے نہیں توڑ سکتی۔ زندگی مسلسل ادراک و فہم کی ایک موج ہے۔ ماضی سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال سے مستقبل جنم لیتا ہے۔

اس کے بعد علامہ نے شعائرِ اسلامی کی تقلید کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تقلید اجتہاد سے افضل تر ہو جاتی ہے۔ علامہ کی نظر میں جب زندگی میں اضمحلال پیدا ہو جائے تو تقلید قوم میں استحکام پیدا کرتی ہے۔ روایات کی پابندی ربط وضبط ملی کا باعث بنتی ہے۔ خزاں کے دور میں درخت سے امید بہار کا سہارا ٹوٹنا نہیں چاہیے۔ روایت ملی کا تحفظ عظمت رفتہ کا باعث بن سکتا ہے۔ یہاں علامہ نے احوال اسرائیل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسے کن مصالب میں سے گزرنا پڑا۔ صدیوں کے طولانی عرصے میں اس پر کیا کیا بیتی۔ پنجۂ فلک نے کس طرح انگور کی مانند اس قوم رس نچوڑ لیا۔ لیکن اس جان ناتواں کی سختی ملاحظہ ہو کہ اس نے آج بھی راہ رفتگاں کو نہیں چھوڑا، اور آج بھی اس کے سینے میں دم موجود ہے ان اشعار میں یہود کے لیے اسرائیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

پیکرت دارد اگر جانِ بصیر
عبرت از احوالِ اسرائیل گیر

آج یہ قوم جسے علامہ نے مثال کے طور پر پیش کیا تھا واقعی مملکت اسرائیل کی تشکیل سے اپنی سخت جانی اور عزم وثبات کا ثبوت فراہم کر چکی ہے۔ جب علامہ نے یہ شعر کہے تھے یہود کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مسئلہ فلسطین ابھی معرض وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن اس دانائے راز نے اس قوم کی پافشاری اور قوت مقاومت کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا، اور اس کے اسباب کا صحیح تجزیہ کر کے اسے امت مسلمہ کے لیے مثال کے طور پر پیش بھی کر دیا تھا۔

ملت اسلامی کے اس دور میں جب کہ اس کے سینے میں شمع زندگی بجھ چکی ہے، علامہ نے اجتہاد کو انتہائی خطرناک کہا ہے۔ اور ''عالمان کم نظر'' کے اجتہاد پر بھروسہ کرنے کی بجائے آباد واجداد کی حکمت پر تکیہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور امت مسلمہ کو خبردار کیا ہے کہ اگر اس نے قرآن کا دامن چھوڑ دیا تو وہ غبار کے مانند بکھر کے رہ جائے گی۔ اگر وہ ایک مضبوط نظام کی بنیاد پر دوام حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے آئین الٰہی کی پابندی کے بغیر چارہ نہیں۔ آئین اسلامی قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہاں علامہ نے آئین الٰہی سے ایک مثال دے کر بتایا ہے کہ اسلام کس طرح خطرات میں زندگی بسر کرنے کو صحیح زندگی قرار دیتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر سرچشمہ صلح کی توقع پر اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے دفاعی انتظامات سے دست بردار ہو جائے تو مسلمان کے لیے اس پر اس وقت تک حملہ حرام ہے جب تک وہ اپنے اندر پھر کس بل پیدا نہ کر لے۔ بقول علامہ شرع اسلامی مسلمان کی قوت بازو کو آزماتی ہے اور اس کے سامنے خطرات کے پہاڑ کھڑے کرتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے۔ جب شارع آئین نے مسلمان کے لیے طاقت کا نسخہ لکھ دیا تو اس کا مقصد ہے کہ مسلمان اپنے عمل سے اپنے اعصاب کو

فولاد میں ڈھال لے۔ یہ آئین زمین کو آسان میں بدلنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں علامہ اس حقیقت پر رنجیدہ ہیں کہ مسلمان شعارِ مصطفیٰؐ کو ترک کے رمز بقا سے ناآشنا اور بیگانہ ہو چکا ہے۔ وہ جس کا عزم پہاڑ کو تنکا سمجھتا تھا توکل کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ وہ جس کے قدم سینکڑوں ہنگامہ آرائیوں کی تخلیق کرتے رہے، قناعت کے کونے میں دبک کر رہ گیا۔ وہ جس کے در پر سکندر و دارا سر جھکاتے تھے، کشکولِ گدائی پر ناز کرنے لگا۔ اب اگر اس کے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے کا سودا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے آئین الٰہی کی پابندی ناگزیر ہے۔ اس کے بعد علامہ قوم کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر حسن سیرت پیدا کرنے کے لیے آدابِ پیغمبرؐ کو اپنے لیے مشعل راہ بنائے۔ نبی اکرمؐ کی ذات سراپا شفقت و رحمت تھی۔ صاحب خلق عظیم کے اتباع میں اسے شفقت و رحمت کا نمونہ بننا چاہیے۔ اسے یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مسلمان کی طنیت پاک ایک ایسا گوہر ہے جس کی آب و تاب پیغمبرؐ کی رہینِ منت ہے۔

ان تمام حقائق کے بعد شاعر نے انسانی معاشرے میں صنف لطیف کی زبردست اہمیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ عورت وہ مضراب ہے جس سے مرد کی شخصیت نغمہ زن ہوتی ہے۔ وہ مرد کا لباس اور زیور ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے نماز اور خوشبو کے ساتھ عورت کی اہمیت کا ذکر فرمایا ہے۔ علامہ کی نظر میں جو مسلمان عورت کو خدمت گزار تصور کرتا ہے وہ قرآن کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امومت رحمت ہے، کیوں کہ اسے نبوت سے نسبت ہے۔ امومت سے ہماری شخصیت کی تعمیر پختہ تو ہوتی ہے۔ اس کی جبین کے نقوش میں ہماری تقدیر لکھی ہے۔ امومت سے رفتارِ زندگی میں حرارت ہے، اور اسی سے زندگی کا راز عیاں ہوتا ہے۔ وہ آئندہ نسل کی محافظ و رہبر ہے۔ اس کے بعد علامہ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے اسوۂ حسنہ اور آپ کے عظیم مرتبے کا ذکر کیا ہے، کہ آپ رحمۃ اللعالمینؐ کی نور چشم تھیں، حضرت علی مرتضیٰؓ کی ہمسر اور حضرت حسینؓ کی والدہ تھیں۔ علامہ نے آپ کی ذات کو مثالی بتاتے ہوئے مسلمان عورت کو تلقین کی ہے کہ وہ بھی آپ کی طرح کسی حسین ایسے سالار کاروان عشق کی پرورش کرے۔

رموز کے آخر میں علامہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان سے بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی مثنوی کے افکار کا خلاصہ مجمل شکل میں اس تفسیر میں ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک رات اُنھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور اُن سے ملت کے دکھ درد کے چارے کے لیے التجا کی آپ نے فرمایا کہ ملت کی آب و تاب کا راز سورۂ اخلاص میں مضمر ہے۔ اس کے بعد آپ نے شاعر کو اس سورۂ کی آیات کا الگ الگ مطلب سمجھایا۔ علامہ نے یہی مطالب یہاں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

خدائے واحد بے نیاز (الصمد) ہے۔ بندۂ حق بھی بندۂ اسباب نہیں اور وہ بھی غیر سے بے نیاز ہے۔ بے نیازی میں بڑے ناز ہیں اور ہر ناز میں ایک نیا انداز ہے۔ یہاں علامہ نے مردِ مومن کی بے نیازی کی

ایک مثال دی ہے۔ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کو کہلا بھیجا کہ ایک دنیا آپ سے درس حدیث کا فیض حاصل کرتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں بھی آپ سے اسرار حدیث سمجھوں۔ آیا ممکن نہیں کہ آپ بغداد تشریف لے آئیں۔ جناب امام نے جواب دیا کہ میں مصطفیؐ کا خادم ہوں اور میرا قلب و ذہن آپ ہی کے عشق سے سرشار ہے۔ آپ کے دامِ محبت میں اسیر ہونے کے باعث میں کسی قیمت پر آپ کے حریم پاک کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میری نظر میں یثرب کی رات عراق کے دن سے روشن تر ہے۔ تو تعلیم کی خاطر مجھے اپنے در پر بلا کر ایک بندۂ آزاد کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ میں ملت کا خادم ہوں اور ملت کا خادم کبھی تیرا چاکر نہیں ہو سکتا۔ اگر تو علمِ دین سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے تو یہاں آ اور میرے حلقۂ درس میں بیٹھ۔ اس کے بعد علامہ ارشاد فرماتے ہیں:

بے نیازی ناز ہا دارد بسے
ناز او انداز ہا دارد بسے

بے نیاز ہونے سے بندۂ مومن حق کے رنگ میں رنگ جاتا ہے بے نیازی کا تقاضا ہے کہ انسان کا فہم دوسرے کے افکار کا غلام نہ ہو۔ اس کی باتیں اور اس کی تمنائیں دوسروں سے مستعار نہ لی گئی ہوں۔ مرد مومن کی حیثیت ستارے کی نہیں، آفتاب کی ہے۔ جو خود اپنی روشنی سے تاباں ہے۔ فرد وہ ہے جو اپنی خودی کو پہچانتا ہے اور قوم وہ ہے جو اپنی خودی سے سرشار ہے اور دوسروں سے جھوٹی مصالحت پر آمادہ نہیں۔

جس طرح خدائے بے نیاز کی شان ''لم یلد ولم یولد'' ہے اسی طرح ملت اسلامی رنگ وخون سے بالاتر اور حسب ونسب کے تقاضوں سے بے نیاز ہے۔ سلمان فارسیؓ کی طرح اس کی شان یہی ہے کہ وہ ''زادۂ اسلام'' ہے۔ مسلمان روم وعرب سے وابستہ نہیں۔ اس نے محبوب حجازی ﷺ کو دل دیا ہے اور یہی جذبۂ عشق اسے دوسرے مسلمان سے وابستہ کرتا ہے۔ یہ رشتۂ عشق نسب سے ماورا اور عرب وعجم سے بالاتر ہے۔ جو مسلمان وطن اور نسب کا پرستار ہے وہ ''لم یلد ولم یولد'' کی معنویت سے نا آشنائے مطلق ہے۔

علامہ مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ ''لم یکن'' سے اپنا رشتہ استوار رکھے تا کہ جیسے خدائے قدوس لاشریک ہے وہ بھی اقوام جہاں میں بے نظیر ہو۔ بندۂ مومن باطل کے مقابلے میں شمشیر آبدار اور حضورِ حق میں سپر ہے۔ اس کے اوامر ونواہی خیر وشر کی کسوٹی ہیں۔ زندگی اس سے تکمیل کا سبق لیتی ہے۔ اس کا ''عفو وعدل و بذل واحسان'' عظیم ہے۔ وہ قہاری میں بھی کرم گستر ہے، وہ شمع بزم بھی ہے اور رونق کارزار بھی۔ اگر بزم میں اس کے نغمے دلنواز ہیں تو رزمگاہ میں اس کا سوز آئین گداز ہے۔ آخر میں علامہ نے مسلمان کو تنبیہ کی ہے کہ وہ قرآن کو چھوڑ کو خوار و زار ہوا ہے۔ آج وہ شبنم کی طرح عاجز اور سرنگوں ہے حالانکہ اس کی منزل ماہ وانجم سے پرے ہے۔

رموزِ بیخودی رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حضور میں عرض حال کے ساتھ ختم ہوتی ہے جو عشق بیتاب کی زندہ داستان ہی نہیں شاعر کے مقصد و آرزو کی آینہ دار بھی ہے۔ ہر شعر سوز و ساز اور عشق و نیاز کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں شاعر نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کے حضور اپنے اشعار کے غیر قرآن سے پاک ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح نہ ہو تو اس کے پردۂ ناموس فکر کو چاک کر دیا جائے اور روز محشر حضور اکرم ﷺ اسے اپنے پائے مبارک کے بوسہ سے محروم رکھیں۔ لیکن اگر اس نے اسرار قرآن کی تفسیر کی ہے تو اس کی تمنا ہے کہ خدائے عز و جل اس کے عشق کو عمل کے ساتھ ہمکنار کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ وفور شوق و محبت کا اظہار اس دیرینہ تمنا کے ساتھ کیا ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ حجاز مقدس میں ہوتا کہ اس کا دل بیتاب آسودگی سے ہمکنار ہو اور فلک اس کی قسمت پر رشک کرے۔ یہ عرض حال ان الہام انگیز اشعار سے شروع ہوتی ہے:

اے ظہورِ تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمین از بار گاہت ارجمند
آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روئے تو
ترک و تاجیک و عرب و ہندوئے تو
از تو بالا پایہ این کائنات
فقرِ تو سرمایہ این کائنات

عرض حال میں شاعر وارفتہ ملت کی تعمیر میں اپنے کردار اور اپنی تمناؤں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

داستانے گفتم از یارانِ نجد
نکہتے آوردم از بستانِ نجد
عقل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم
گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم جز بہ قرآن مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
این خیابان را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر درِ اسرارِ قرآن سفتہ ام
با مسلمانان اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزوجل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اس کتاب پر علامہ کو بہت ناز تھا۔ ۲۷/جون ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں اس موضوع پر رقم طراز ہیں:

جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔[۴]

کتاب کی طباعت سے پہلے ۴/نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک خط میں ارشاد ہوتا ہے:

اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔[۵]

رموزِ بیخودی میں علامہ نے جو فلسفہ پیش کیا اس کی اساس ملت اسلامی کے روحانی و فکری عقائد اور تمدن و اخلاق پر تھی۔ البتہ اسے ایک نہایت اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس پر مغربی ردعمل کے بارے میں اُنھوں نے ایک خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا:

رموزِ بیخودی کے ترجمے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں مگر اُمید نہیں کہ اس کا ترجمہ یورپ میں ہو کہ اس کے مضمون سے یورپ والوں کو چنداں دلچسپی نہیں ہے۔ مسلمان ہی اس کا مفہوم سمجھ جائیں تو غنیمت ہے۔[۶]

(ڈاکٹر عبدالشکور احسن— اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ)

حوالہ جات وحواشی

۱- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، ص۱۱۔
۲- ایضاً۔
۳- میکیاولی (۱۵۳۲ء) فلارنس (اٹلی) کا رہنے والا تھا۔ اس کی متذکرہ کتاب کا انگریزی عنوان The Prince ہے۔
۴- مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، ص۱۰۔
۵- ایضاً۔
۶- ایضاً۔